Society & Social Problems

24-3-05

جنگ

بے حس، بے پروا، اپنی دھن میں مگن

حرف راز/اوریا مقبول جان

ٹیلی ویژن پر اچانک کوئی ڈرامہ، موسیقی کا پروگرام یا گفتگو روک دی جاتی ہے۔ زوردار بیک گراؤنڈ موسیقی کے ساتھ تازہ ترین یا پھر "Breaking News" کے لفظ سکرین پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اناؤنسر کسی انہدوناک حادثے، کسی بم دھماکے یا پھر کسی خودکش حملے کی خبر سناتی ہے اور ساتھ ہی مہیا فلم چلنے لگتی ہے۔ جسموں کے پرخچے اڑے ہوئے ہیں۔ دکانوں، مکانوں، بلڈنگوں کو آگ لگی ہوئی ہے۔ دھویں کے بادل چھائے ہوئے، لوگ چیختے چلاتے مختلف سمتوں میں دوڑ رہے ہیں۔ گھر کے ڈرائنگ روم یا لاؤنج میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ منظر دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ جیسے ہی خبر ختم ہوتی ہے۔ پھر پہلے جیسی بھاگم دوڑ مچ جاتی ہے۔ کوئی اوپر سے چیخ رہا ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ پھر وہاں سیٹ اچھی نہیں ملے گی۔ کسی گھر میں یہ بحث پھر سے شروع ہو جاتی ہے کہ کونسے ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا جائے۔ کسی جگہ کا کھانا زیادہ اچھا ہے۔ ٹیلی ویژن پر یہ سب مناظر بار بار دکھائے جا رہے ہوتے ہیں اور آراستہ پیراستہ، پرسکون اور آرام دہ گھروں میں کوئی اپنے سوٹ کے ساتھ قمیص کا رنگ میچ کر رہا ہوتا ہے اور کوئی خاتون اپنی لپ سٹک درست کر رہی ہوتی ہے کہ جلد کسی پارٹی میں جانا ہے۔ کہیں کسی گھر میں تھوڑی دیر کے لئے اس پر بات شروع ہوتی ہے تو اچانک روک دی جاتی ہے۔ چھوڑو یار پہلے بہت ڈیپریشن ہے۔ زندگی میں اور بہت مسائل ہیں، اب ہم ان باتوں کو لے کر بیٹھ جائیں تو پھر گئے کام سے۔ اور پھر گفتگو کا رخ کسی خوشگوار موضوع کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کا چینل بدل کر اس پر موسیقی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ اور یوں لگنے لگتا ہے جیسے تھوڑی دیر پہلے جو خبر نشر ہوئی تھی وہ شاید کسی فلم کا سین تھا، کسی ڈرامے کا منظر تھا یا پھر کوئی افسانہ۔

صبح کی چائے یا ناشتے کے ساتھ میز پر اخبار آتا ہے۔ اگر صاحب اکیلے ہوں تو وہ چند ایک خبریں پڑھتے ہیں۔ اور یہ تو ایک لازمی بات ہے کہ اخبار میں ایک خودکشی کی خبر ضرور ہوگی۔ وہ ایسی ہی خبر پر سرسری نگاہ ڈال کر دوسری خبروں پر توجہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک دو لوگوں یا اہل خانہ کے ساتھ ہوں تو ایسی خبر چند سیکنڈ کے لئے گفتگو کا موضوع ضرور بنتی ہے۔ کیسی کیسی خوفناک اور دل کو دہلا دینے والی خبریں ہوتیں ہیں۔ ماں نے بھوک سے تنگ آ کر بچے کھچے پیسوں سے زہر خریدا اور اپنے چاروں بچوں کو کھانے میں ملا کر کھلا دیا۔ صبح تک پانچوں موت کی آغوش میں تھے۔ کہیں نوجوان رسی پر جھول رہا ہوتا ہے اور کہیں خاتون اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ختم کر لیتی ہے۔ میسر آ جائے تو ایسی تصویریں بھی اخبار کی زینت ہوتی ہیں۔ ناشتہ کرتے کرتے ایک لمحے کو لوگ چونکتے ہیں۔ اور پھر کسی کے دفتر جانے کی تلوار سر پر لٹک رہی ہوتی ہے۔ کسی کو بچوں کو سکول چھوڑنا ہوتا ہے۔ کسی نے اپنی دکان سجانا ہوتی ہے۔ چائے کے خالی کپ کے ساتھ اخبار پر بچی خبر اور رسے پر جھولتی تصویر تنہا پڑی رہ جاتی ہے اور سب اپنے اپنے کاموں میں یوں مصروف ہو جاتے ہیں جیسے ایسا کوئی حادثہ اس شہر، ملک یا سرزمین میں ہوا ہی نہیں تھا۔ جیسے موت کسی ایسے گھر میں آئی ہی نہیں۔

بسوں کے ٹکرانے، ٹرینوں کے الٹنے، بم دھماکوں میں جسموں کے پرخچے اڑنے اور اندھی گولیوں کے فائر سے مرنے والوں کی خبروں سے بے نیاز ہم لوگ اپنی زندگی میں رواں دواں رہتے ہیں۔ کسی کی محرومی ہمارے لئے کوئی حادثہ یا خبر نہیں ہوتی۔ ہماری روزمرہ کے معمولات ویسے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سب اموات سے حادثات سے ہمارے معمولات متاثر ہی نہیں ہوتے۔ ہم پر ان کا اثر کیسے ہو۔ لیکن اگر یہی محروم، بے روزگار یا بھوکا شخص کسی کے کہنے پر، کسی کے لالچ میں، یا پھر دنیا کے اس تمسخر کا انتقام لینے کے لئے کبھی کوئی بجلی کا کھمبا اڑا دے اور ہمارے ایئرکنڈیشنر چند گھنٹوں کو بند ہو جائیں تو ہم وہ چند گھنٹے صرف اسی موضوع پر گزار دیتے ہیں۔ وہ بجلی کا چلا جانا ہمارے لئے دنیا کا سب سے بڑا سانحہ اور المیہ ہوتا ہے۔ ہماری زندگی میں چند دن گیس کا چولہا نہ جلے تو ہماری محفلوں میں دنوں یہ بات ہوتی رہتی ہے کہ سب کیوں ہو گیا کیسے ہو گیا۔ کون کروا رہا ہے۔ سب بند کیوں نہیں ہوتا۔ اس کا حل کیا ہے۔ لیکن پچاس سال تک گیس کے قرب و جوار میں رہنے والوں کو پہاڑوں سے لکڑیاں کاٹ کر اپنا چولہا جلاتے اور میلوں پانی کی تلاش میں سرگرداں رہتے کوئی نہیں دیکھتا۔ ہمیں تو اسی کانٹے کی تکلیف ہوتی ہے جو ہمیں چبھتا ہے۔ جس تیر کا مقدر دوسرے کو لہولہان کرنا ہو، ہماری بلا سے کل چلنا ہو تو آج چل جائے۔

جن قوموں کی حیثیت رکھنے والے اور عیش و آرام کی زندگی گزارنے والے لوگوں کے دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ بم دھماکوں میں مرنے والوں کی تعداد بڑھتی رہے رقص و سرود پر کوئی فرق نہیں آتا۔ روز بے شک 8 آدمی بھوک سے خودکشی کریں نہ کسی صاحب اقتدار کے ایوان کے روز کے خرچے میں کمی آئے اور نہ ہی عام آدمی کی تقریب میں بھنے ہوئے مرغوں اور کبابوں کی تعداد کم ہو تو ایسے میں وہ سب لوگ جو محروم ہوتے ہیں انہیں بتانا پڑتا ہے کہ دکھ کیا ہوتا ہے۔ چبھن کس کو کہتے ہیں۔ موت کس چیز کا نام ہے۔

ایسے ہی بے حس بے پروا اور عام لوگوں کی تکلیفوں سے دور چند لوگ 1793 میں ورسائلز کے محلات میں جشن منا رہے تھے۔ لوگ بھوک سے خودکشیاں کر رہے تھے اور بچوں کو ذبح کر رہے تھے لیکن دوسری طرف ایک پرشکوہ ضیافت چل رہی تھی۔ اور پھر موت کی تلخی سے آشنا لوگ ہجوم کی صورت میں بڑھے جو جس کے ہاتھ آیا قتل ہوا۔ بادشاہ کو بگھی میں بٹھا کر چبوترے پر لایا گیا۔ ایک بہت بڑا چاقو گرا اور بادشاہ کا خون نیچے بہنے لگا۔ لوگوں نے اس مقدس خون میں انگلیاں ڈبو لیں۔ ایک نے چکھا اور بولا "یہ مکروہ اور نمکین ہے" اس دن پیرس میں کوئی سوگ کا سماں نہیں تھا۔ تھیٹر پر لوگوں کا رش تھا شراب خانے بھرے ہوئے تھے میت کو میڈلین کے قبرستان میں پھینک کر چونے سے ڈھانپ دیا گیا اور تاریخ کے صفحات پر ایک فقرہ لکھ دیا گیا۔ جو لوگوں کے دکھوں، مصیبتوں اور تکلیفوں سے بے پروا ہو جاتے ہیں ان کی موت پر آنسو نہیں بہتے، انہیں یاد کر کے رویا نہیں جاتا۔

Society & Social Problems

14-1-05

مخاصمت اور چشمک ...... کب اور کہاں تک

کشور ناہید

اردو ادب میں داغ اور غالب کی مخاصمت تو مشہور تھی مگر بعد میں نہ علامہ اقبالؒ کے مقابلے پر کوئی اترا اور نہ فیض صاحب کے۔ کافی عرصے تک ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے مصاحبین، قاسمی صاحب کے خلاف حاشیہ آرائی کراتے رہے۔ جواب آں غزل بھی ہوتا رہا پھر جسموں کی نقاہت نے اس چشمک کو کم کر دیا اور اب کبھی کبھار، کہیں کوئی حرف زنی ہوتی ہے۔

رہے ہمارے عزیز دوست انیس ناگی تو وہ مخالفت اس طرح کرتے ہیں کہ یار لوگوں، ہم عصروں اور سینئرز کے ادب کے حوالے سے بڑی سخت تنقید کرتے ہیں مگر ذاتیات پر کبھی نہیں اترتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ترازو میں کوئی خوش نصیب ہوتا ہے جو برابر تلتا ہے ورنہ ہر ایک کا وزن ان سے کم نکلتا ہے۔

ادب میں گروپ بازی بہت رہی اور کوئی بری بھی نہیں لگتی۔ مجھے یاد ہے قیوم نظر کے مقابلے میں حلقہ ارباب ذوق کی سیکرٹری شپ کے لئے انتظار حسین کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں جانب سے ادیبوں کو ووٹ ڈالنے کے لئے باقاعدہ کوئی نہ کوئی حسب مقدور ٹرانسپورٹ فراہم کی گئی تھی۔ یہ بڑا معرکہ تھا کہ انتظار حسین نے قیوم نظر کو ہرا دیا تھا۔

ٹی ہاؤس میں ایک ٹیبل پر افتخار جالب، انیس ناگی، عزیز الحق، ان کے چھوٹے سعادت سعید، شاہد محمود ندیم اور خالد لٹڈو ہوتے تھے۔ دوسری جانب کی میز پر انتظار حسین، ناصر کاظمی، شہرت بخاری، احمد مشتاق، انجم رومانی، سجاد باقر رضوی ہوا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی کے انتقال کے بعد اور بھٹو صاحب کو ہٹا کر سخت ترین مارشل لا لگانے والوں کے باعث احمد مشتاق اور شہرت بخاری ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ سجاد باقر رضوی، شادی کے بعد ٹی ہاؤس کم اور سہیل افتخار انسٹیٹیوٹ زیادہ بیٹھنے لگے۔ انجم رومانی کو ویسے ہی دوستیوں کو زندہ رکھنے کا شوق نہیں تھا۔ اکیلے انتظار حسین ٹی ہاؤس میں رہ گئے مگر اب رفیق بدل گئے۔ اکرام اللہ، زاہد ڈار، مسعود اشعر اور شاہد حمید درمیان کی ٹیبل پر کونے کی ایک میز پر سلیم شاہد، الطاف قریشی، یونس جاوید، احمد بشیر اور کبھی کبھی ندرت الطاف بیٹھا کرتی تھیں۔ اب یہ میزیں کیا ٹی ہاؤس ہی ویران ہو گیا ہے۔

ان تمام لوگوں پہ یہ لازمی نہیں تھا کہ اپنی سیٹ نہ چھوڑیں یا میں جب جاؤں تو بس ایک ٹیبل پہ بیٹھوں، میں ساری میزوں پر بیٹھ کر سب سے باتیں کرتی، چائے پیتی اور ٹی ہاؤس کے بیروں کو اپنی غیر حاضری کا ٹیکس دیتی اور واپس آ جاتی۔ کئی دفعہ بھڑک اٹھتی تو میں اتوار کو ٹی ہاؤس جانے کے لئے لاہور چلی جاتی۔ مجھے دیکھتے ہی مسعود اشعر فوراً کہہ اٹھتے "تم پھر آ گئی ہو" مجھے برا لگا اور پھر میں نے اتوار کو لاہور جانا بند کر دیا۔

پچھلے دنوں میں لندن میں تھی۔ چند نوجوان ادیبوں نے کہا کچھ لوگ آپ سے "خاص محبت" کرتے ہیں۔ گزشتہ چند سال ہوئے ایک ادیب صحافی جو نواز شریف دور میں سفیر بھی رہے ہیں، لندن آئے تو کہہ رہے تھے "ہمیں تو فوراً نوکری سے نکال دیا گیا دیکھیں اگر کشور ناہید کے گورنمنٹ میں تعلقات نہ ہوتے تو ابھی تک کیسے ملازمت میں ہوتی؟"

یہی بلکہ اسی طرح کا حادثہ دہلی میں ہوا۔ ہمارے بہت بڑے ادیب اجیت کور کو ملنے گئے اور ناراض ہو کر کہا "آپ غلط لوگوں کی مہمان ہو جاتی ہیں وہ تو گورنمنٹ کی ایجنٹ ہے۔ آپ پاکستان میں صحیح لوگوں سے ملا کریں۔" اجیت نے کہا "وہ تو میری دوست ہے، آپ میری دوست کے خلاف بغیر کسی سبب کے اس طرح بات نہ کریں۔" میرے عزیز دوست یہ سن کر حسب معمول ناراض ہو کر کھانے کی تھالی کو باہر اٹھا کر پھینک کر خود باہر نکل آئے۔

غیر ممالک میں جا کر ہم عصر ادیبوں میں سے دو ادیب تو خیر سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں ایک دوسرے کے خلاف باتیں کرنے کی۔ ان دونوں کو تو اب کسی نے سمجھانا بھی چھوڑ دیا ہے کہ یہ دونوں لاعلاج ہیں مگر افسوس کا اظہار سب کرتے ہیں کہ ایسی عبرتناک چشمک بہت نامناسب ہے۔

کئی سال ہوئے ایک دم ایک وبا پھوٹی تھی، شہر شہر سے کہیں ہفت روزے تو کہیں ماہنامے نکلنا شروع ہوئے تھے۔ ان میں کہنے کو تو ادبی خبریں ہوتی تھیں مگر کسی کی طلاق سے لے کر معاشقے اور ادبی سرقے تک سبھی خبریں چاشنی کے ساتھ رنگ برنگی تصاویر سے فرین چھپتی تھیں۔ پھر شاید ان پرچوں کو چھپوانے والے یا تو چلے گئے یا پھر کوئی اور صورت ہوئی کہ وہ آہستہ آہستہ بند ہو گئے۔

مقصد اس طول کلام کا یہ ہے کہ ملک میں تو ایک دوسرے کے خلاف پرچہ بازی، بیان بازی، بدکلامی، بے ہودگی، غلط بیانی، ہرزہ سرائی، سب کچھ کرو ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی بیخ پا ہو جاؤ، کمرے سے نکل جاؤ مگر کم از کم دوسرے ملکوں میں جا کر تو بدلحاظی سے گریز اس لئے کرو کہ بچے اور نوجوان آپ کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ کبھی ان دلیر جوانوں کو دوسروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ جو لوگ دوسروں کو برا کہتے ہیں وہ اپنے بارے میں بھی کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتے۔

آپ کہیں گے کہ دنیا بھر کے سارے ادیب، چھوٹی موٹی چشمک تو رکھتے ہیں آخر راشد صاحب بھی تو فیض صاحب کا نام برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ حفیظ صاحب بھی تو فیض صاحب کے بارے میں سکینڈل بازی کرتے تھے۔ تو کیا لوگوں نے ان کے بارے میں اچھی رائے قائم کر لی تھی۔ نہیں، یہی سبب ہے کہ لوگ آج بھی ان کی باتوں کو خوش مزاجی پر محمول نہیں سمجھتے ہیں۔

ساری دنیا کے لوگ ادیبوں سے ناشائستہ گفتگو اور تہذیب سے گرے ہوئے مکالموں کی توقع نہیں کرتے ہیں۔ کیا لوگ سادہ دل ہیں کہ ادیب......

پاکستان میں اونچ نیچ کی انتہائیں

حرفِ تمنا

☆☆☆☆☆

ارشاد احمد حقانی

آج کی دو خبریں ملا کر پڑھیے:

اگلے روز ایک رکن کے سوال کے جواب میں قومی اسمبلی کو بتایا گیا کہ پچھلے تین سال میں انتہائی مہنگی اور پرتعیش کاروں کی خریدپر (دل تھام کر سنیئے) ایک ارب 80 کروڑ روپے حکومت نے خرچ کئے۔ ان میں سے 22 مرسڈیز بینز (ایک انتہائی مہنگی کار) 2005ء کے پہلے دو مہینوں میں براہ راست وزیراعظم شوکت عزیز کے حکم کے تحت خریدی گئیں۔ باقی 20 کے قریب کاریں اس سے پہلے کے عرصے میں خرید کی گئیں۔ یہ نئی خریداری اس حقیقت کے باوجود کی گئی کہ کابینہ ڈویژن کے پاس 45 مہنگی گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں سے 31 مرسڈیز بینز تھیں۔ یوں کابینہ ڈویژن کے پاس صدر، وزیراعظم اور دوسری چند اہم سرکاری شخصیات کے استعمال کے لئے 88 قیمتی کاروں کا بیڑا جمع ہو گیا ہے۔ یہ کاریں صرف چند ایک بالائی شخصیات کے زیر استعمال رہیں گی۔

اور اب دوسری خبر:

باقی دنیا کی طرح پاکستان میں بھی 24 مارچ کو انسداد تپ دق کا دن منایا گیا۔ اس موقع پر جو تلخ ترین حقائق سامنے آئے ان میں سے بعض یہ تھے: تپ دق کے مریضوں کی تعداد اور تناسب کے حوالے سے دنیا کے انتہائی متاثر 20 ممالک میں سے پاکستان کا نمبر چھٹا یا ساتواں تھا۔ ملک میں اس وقت 40 لاکھ سے زیادہ ٹی بی کے مریض ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستان میں ہر سال اڑھائی لاکھ نئے افراد تپ دق کے مرض کی گرفت میں آتے ہیں۔ صرف پنجاب میں ہر سال سوا لاکھ نئے لوگ تپ دق کا شکار بنتے ہیں۔ تمام مریضوں میں نصف تعداد عورتوں کی ہے اور ایسی متاثرہ عورتیں اس عمر میں ہیں جب ان کے ہاں بچوں کی پیدائش ہو رہی ہوتی ہے۔ ماہرین نے بتایا ہے کہ پاکستان میں ہر سال 60 ہزار انسان تپ دق کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے اس مرض کی گرفت میں آنے والوں کی غالب ترین تعداد غریب لوگوں کی ہوتی ہے جو پہلے ناقص غذا، غیر صحت مند ماحول اور پھر ابتدائی مراحل میں علاج نہ کروا سکنے کی وجہ سے بیمار پڑتے ہیں۔ علاج معالجے کی سہولتیں انتہائی ناکافی ہیں جس سے مرض کنٹرول کرنا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے۔ 24 مارچ کو جب پاکستان میں بھی تپ دق کے انسداد کا دن منایا گیا تو بعض تقریبات میں حکومتی ترجمانوں نے عوام کو بہترین طبی سہولتیں فراہم کرانے کی یقین دہانی کرائی۔

متذکرہ صدر دو خبروں سے پاکستانی معاشرے کی کیسی تصویر سامنے آتی ہے؟ ایک طرف گنتی کے چوٹی کے حکمرانوں کے لئے صرف سال 2005ء کے ابتدائی دو مہینوں میں ایک ارب کے قریب مالیت کی گاڑیاں اس حال میں خریدی جاتی ہیں کہ پہلے ہی پرتعیش کاروں کا ایک پورا بیڑا کابینہ ڈویژن کے پاس موجود تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس نئی خریداری کا کوئی جواز تھا؟ مہنگی ترین کاروں کے بغیر وی وی آئی پی حکمرانوں کو سفر کرنے میں کوئی مشکل پیش آ رہی تھی؟ کیا اس ملک میں جہاں کم از کم پانچ کروڑ افراد خط افلاس سے نیچے رہ رہے ہیں اور جہاں مہنگائی میں اضافے کی شرح 10 فیصد کے قریب پہنچ چکی ہے، جہاں تیل کی قیمتوں میں آئے دن اضافہ کیا جا رہا ہے تاکہ اس بالواسطہ ٹیکس سے 45 ارب روپے سالانہ جمع کئے جا سکیں اور اس اضافے کی وجہ سے ملک کے متوسط اور نچلے متوسط طبقے میں ہاہاکار مچی ہوئی ہے، اس غیر ضروری خریداری کا کوئی جواز تھا؟ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ الخلق عیال اللہ۔ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ جب پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے تو ابنائے وطن کا ایک دوسرے سے رشتہ اور بھی زیادہ گہرا اور قوی سمجھا جا سکتا ہے اور ان کی حیثیت ایک خاندان کی سی ہونی چاہئے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ ایک ہی خاندان کے بعض ارکان تو دنیا کی ہر نعمت سے فیضیاب ہو رہے ہوں جبکہ دوسرے ارکان عسرت و تنگدستی اور فاقہ کشی کی گرفت میں ہوں اور تپ دق جیسا موذی مرض لاکھوں کی تعداد میں انہیں نگل رہا ہو۔ اقبال کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے:

مے کدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے، مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا

پاکستان کے قیام کے اگر دو تین انتہائی اہم مقاصد بیان کئے جائیں تو عدل اجتماعی کا اہتمام ان میں سرفہرست ہو گا۔ کیا ہم نے اس مقصد کے حصول کی کوئی دیانتدارانہ کوشش کی ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ کروڑوں عوام کو پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں۔ ملک کے 29 فیصد شہری گھروں میں ٹائلٹ کی ابتدائی سہولت بھی موجود نہیں۔ بیمار پڑنے والے اپنا علاج نہیں کرا سکتے۔ اچھی تعلیم مہنگی بلکہ بے حد مہنگی ہے اور کروڑوں بچے اس سے محروم ہیں اور ہماری حکومت دو تین بڑے حکمرانوں کے لئے 45 قیمتی گاڑیوں کی موجودگی سے بھی مطمئن نہیں جو اتنی ہی مزید خریدتی ہے۔

صدر مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز ان دنوں یہ کہنے کے عادی ہیں کہ معاشی ترقی کے ثمرات عنقریب عوام تک پہنچنے شروع ہو جائیں گے۔ صدر نے اس وعدے کا اعادہ 23 مارچ کی تقریر میں بھی کیا ہے اور وزیراعظم کا تو یہ فقرہ اوڑھنا بچھونا ہے ہی لیکن ترقی کے ثمرات عوام تک جب پہنچیں گے جب اس ملک کی طفیلی کلاس کچھ وسائل بچنے دے گی۔ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف ہمارے جذبات چونکہ بہت شدید ہیں اس لئے ہم متذکرہ صدر قسم کی خبروں پر اگر شاکی ہوتے ہیں تو یہ بات ناقابل فہم نہ ہونی چاہئے۔ حکمران خدا کے غضب سے ڈریں۔ غلط کار کی رسی دراز ہے لیکن آخر کار ڈھیل ختم ہو جاتی ہے۔ عام آدمی کے ساتھ انصاف کریں اور اس کے خون پسینے سے جمع ہونے والے خزانے کو حلوائی کی دکان اور نانا جی کی فاتحہ کی طرح نہ اڑائیں۔ کیا ہندوستان کے حکمرانوں کے پاس اپنے استعمال کے لئے اسی طرح مرسڈیز بینز کاروں کے بیڑوں کے بیڑے ہیں؟ کیا وہ ہم سے چھوٹا ملک ہے؟ کیا وہ ہم سے غریب ملک ہے؟ آپ سکینڈے نیویا کے ممالک کو دیکھئے۔ دنیا کا بہترین سوشل سیکورٹی کا نظام وہاں موجود ہے لیکن ملک کے حکمران اوسط درجے کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کو خدا اور خلق کی ناراضگی کا احساس نہیں ہے تو ان ترقی یافتہ ممالک کے حکمرانوں کے طور طریقوں ہی سے کچھ سبق سیکھ لیں۔ آخر بے انصافی اور اونچ نیچ کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔

کرم ——— (انور شعور)

ترقی پسندی و روشن خیالی
زمانے سے اہلِ کرم دے رہے ہیں
کبھی بھیجتا تھا ہمیں روس یہ شے
اب امریکۂ محترم دے رہے ہیں